© rasailojaraid.com

Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 37, Sr.No.105, 2016 pp 137 - 156

مجلہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم اِشرقیہ
جلد ۳۷، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۱۰۵

سیاچن کے پس منظر میں رفیق ڈوگر کا ایک اہم سفرنامہ

صبا بشیر/ ڈاکٹر فیاض احمد فیضی ☆

Abstract:

Rafique Dogar is a famous journalist. He travelled through the country and abroad as well. He went to Siacheen to report the war between Pakistan and India. What he saw there? he wrote it in his book "Operation Siacheen". It is an important book. It tells us the basic reasons of conflict between two countries. It tells us that how Pakistan army survives and defend their motherland. It tells us the problems faced by Pak Army in the highest battle field of the World. It is an important book and it has an historical value too.

رفیق ڈوگر کا اصلی نام محمد رفیق طاہر ہے۔ ۶ جون ۱۹۳۹ء کو تحصیل بٹالہ ضلع گرداس پور نواں پنڈ پیر آلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں ٹبے سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور سمندری چلے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں وہاں سے میٹرک کیا۔ ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور سے ایف ایس سی نان میڈیکل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اسی دوران وہ شعبہ تدریس سے منسلک ہو گئے۔ اور بارڈر پر بسین سکول میں سائنس اور میتھ پڑھاتے رہے۔ دوران تدریس ہی انھوں نے بی اے کیا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں ایم۔ اے اردو اور ۱۹۶۸ء میں ایم اے انگلش کیا۔ اس وقت ''سپورٹس ٹائم'' واحد رسالہ نکلتا تھا۔ آپ اس میں لکھنے لگے ستمبر ۱۹۶۸ء میں آپ کی پہلی تحریر ''سپورٹس ٹائم'' میں چھپی۔ آپ لاہور میں جسارت کے نمائندہ رہے اور نوائے وقت کے رپورٹر رہے۔ ۱۹۶۷ء میں آپ کی پہلی شادی ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں آپ کی دوسری شادی ہوئی آپ کی پہلی زوجہ بھی شعبہ تدریس سے وابستہ تھی۔ تاہم ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ خالق حقیقی سے جا ملی ان سے آپ کے تین بچے ہیں۔ آپ کی دوسری زوجہ محترمہ بھی سکول ہیڈ مسٹریس ہیں۔ [۱]

☆ اسکالر ایم۔ فل اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ نے بہت سارے ناول اور سفر نامے لکھے جن میں اب رود آب گنگا نیل، بہتا رہا، آپریشن بلوچستان، آپریشن سیاچن اور آپریشن صومالیہ شامل ہیں۔ آگے چل کر آپ کے سفر نامے آپریشن سیاچن اور آپریشن صومالیہ کا تفصیلاً جائزہ لیا جائے گا۔ ''آپریشن صومالیہ'' صومالیہ پہلی بار ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا۔ جب کہ آپریشن سیاچن ۲۰۰۶ء میں پہلی بار جنگ پبلشرز نے شائع کیا۔''[۲]

''آپریشن سیاچن'' کی تاریخی اہمیت

سیاچن کے آپریشن کے تناظر میں لکھا گیا رفیق ڈوگر کا سفر نامہ ''آپریشن سیاچن'' تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں سیاچن کے گلیشئر پر کیے گئے آپریشن کی تاریخ موجود ہے۔ رفیق ڈوگر صاحب وہاں صحافی کی حیثیت سے گئے اور سیاچن کے آپریشن کو اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں بیان کیا۔ رفیق ڈوگر نے وہاں کی چیزوں کا مشاہدہ ایک صحافی کی نظر سے کیا۔ ایک صحافی کی نظر بڑی گہری ہوتی ہے اور عمیق سے عمیق چیز بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ انھوں نے تمام اہم واقعات کا بیان اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔ وہ تاریخی واقعات جسے ایک مورخ غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ یا جن واقعات پر مورخ کی نظر نہیں پڑتی۔ رفیق ڈوگر ان واقعات پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ سفر ناموں کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ سفر ناموں میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جنھیں تاریخ کی کتابوں میں جگہ نہیں ملتی۔ رفیق ڈوگر جب سیاچن کے محاذ پر بطور صحافی گئے تو انھیں سیاچن کی بلندیوں پر جانے سے پہلے مخصوص لباس پہننے کی ٹریننگ دی گئی، کیوں کہ سیاچن کی بلندی اور سردی کے لیے کچھ لباس مخصوص ہیں۔ جو اس سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ رفیق ڈوگر رقم طراز کرتے ہیں۔

> ''گزشتہ شب ہمیں سیاچن کی بلندیوں اور موسموں کے لیے یہ مخصوص لباس پہننے کی تربیت دی گئی۔ اس کے باوجود صبح ایک دوسرے کی مدد کے بغیر اس میں داخل ہونا دشوار تھا۔''[۳]

گلگت بلتستان کا یہ علاقہ جہاں اس وقت سیاچن کے سفید برف پوش بلند پہاڑی سلسلے ہیں۔ کسی دور میں یہ کشمیر کا جز تھا۔ ۱۹۳۵ء میں انگریزوں نے یہ علاقہ مہاراجہ کشمیر، ہری سنگھ سے ساٹھ سالہ پٹے پر حاصل کیا لیکن جب انھیں محسوس ہوا کہ برصغیر میں ان کا مزید قیام ممکن نہیں اور بہت جلد محسوس ہوا کہ برصغیر میں ان کا مزید قیام ممکن نہیں اور بہت جلد انھیں بوریا بستر باندھنا پڑے گا۔ تو یہ علاقہ بھی انھوں نے مہاراجہ کو لوٹا دیا۔ جس نے اپنے چچا زاد بھائی بریگیڈیئر گھنسار سنگھ جو اس وقت سری نگر میں بریگیڈ کمانڈ رتھا، گورنر بنا کر گلگت بھیج دیا۔ بلتی زبان میں درے کو''لا'' کہا جاتا ہے۔ سیاچن کے شمالی کنارے پاکستان کی جانب ہونے والے ایسے درے پانچ ہیں ان دروں میں سے ''بیلال فنڈلا'' کی شہرت دوسرے دروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ جس کی وجہ قائد پوسٹ ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس پوسٹ کا نام تبدیل کر دیا تھا رفیق ڈوگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس پوسٹ کے نام کی تبدیلی کا یہ تاریخی واقعہ اور محل وقوع ایک فوجی افسر کی زبانی یوں نقل کرتے ہیں:

> برف پوش پہاڑ کی چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک افسر نے اس پوسٹ کا محل وقوع سمجھایا اور بتایا کہ جس کمپنی نے اس بلندی پر چڑھ کر یہ پوسٹ قائم کی تھی۔اس کا فوجی نام لیڈر کمپنی تھا۔اس کے نام پر اس کی قائم کردہ پوسٹ لیڈر پوسٹ کہلائی۔لیڈر کا اردو ترجمہ قائد کیا گیا۔ ہمارے سیاست دانوں نے کے قائد پوسٹ پر قبضے کی خبر پڑھی تو اسے قائد پوسٹ بنا دیا۔اس سے اس پوسٹ اور اس پر بھارتی قبضہ وزنی ہو گیا۔[۴]

قائداعظم پوسٹ انتہائی بلندی کے مقام پر واقع ہے۔اس دور میں بھارت کی پوزیشن غیر مستحکم ہو گئی تھی۔ بھارتیوں کی پوزیشن اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ پاکستان کے محافظ جب چاہتے ان کی سپلائی لائن قطع کر دیتے۔ یہ برتری بھارتی کمانڈروں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔اس وجہ سے وہ پریشانی میں مبتلا تھے آپریشن سیاچن کی وجہ پاکستان کی یہی برتری تھی۔اس لیے بھارتیوں نے پوری منصوبہ بندی کے تحت اپنی توپیں ایسی جگہ پہنچائی جہاں سے قائداعظم پوسٹ پر قبضہ کرنا آسان تھا۔ان پوسٹوں تک صرف رسوں کی مدد سے ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ان تک رسائی کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔بھارتیوں نے پوسٹ پر گولہ باری شروع کر دی۔جس کی وجہ سے پاکستان کی سپلائی لائن کٹ گئی۔اسلحہ وہاں تک پہنچانا صرف رات کو ممکن تھا۔ایریا کمانڈر نے تمام صورت حال سے جنرل بنگش اور سیاچن کے کمانڈر بریگیڈیئر پرویز اکبر کو باخبر کیا ۔تاہم انھوں نے اس بات کو نظرانداز کر دیا اور کہا کہ پوسٹ پر بھارتی حملہ ناممکن ہے۔پاکستانی کمانڈوز نے بھی اس طرف کچھ خاص توجہ دی اور سیاچن کے کمانڈر کی رپورٹ پر ہی اکتفا کیا۔اس کے مطابق بھارتیوں کا اس پوسٹ تک پہنچنا ممکن ہے۔جو اس کی خام خیالی تھی۔رفیق ڈوگر اس صورت حال کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ایریا کمانڈروں نے جنرل بنگش اور سیاچن کے کمانڈر بریگیڈیئر پرویز اکبر کو اس نازک صورت حال سے آگاہ کیا اور بھارتی توپوں کو خاموش کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔انھوں نے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا کہ بھارت اس پوسٹ پر حملہ کرنے والا ہے۔بریگیڈ کمانڈرز نے ایس ایس جی (کمانڈوز) والوں سے رپورٹ مانگی۔انھوں نے اس پوسٹ پر بھارتی حملہ کو ناممکن قرار دے دیا۔بریگیڈ کمانڈر نے نہ توپوں کو خاموش کرنے سے اتفاق کیا اور نہ ہی ایریا کمانڈروں کے خدشات سے اور دوسرے محاذوں پر سیر سپاٹوں کو چل دیے۔ بھارت والوں نے دن کے بعد رات کو بھی گولہ باری شروع کر دی۔پوسٹ پر متعین عملہ محصور ہو گیا۔دو روز تک نہ خوراک پہنچائی جا سکی نہ کوئی امداد۔پاکستانی بریگیڈ کمانڈر اس خطرے کا پورا احساس نہ کر سکا۔وہ کمانڈوز کی اس رپورٹ سے مطمئن تھا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھارتی اس بلندی تک نہیں چڑھ سکتے۔ توپوں کی مسلسل گولہ باری سے پہاڑی کی برف پوش ڈھلوان پر گہرے زخم لگے تھے، بھارتی ان زخموں پر پاؤں رکھتے ہوئے پوسٹ تک پہنچ گئے۔ محصور محافظوں نے آخری گولی تک مقابلہ کیا اور پوسٹ پر بھارت کا قبضہ ہو گیا۔"[۵]

سفرنامے اس لیے دوسرے اصناف ادب سے اہم ہوتے ہیں کہ ان میں کسی ملک، علاقے یا خطے کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ رفیق ڈوگر کا سفرنامہ "آپریشن سیاچن" اس لیے اہم ہے کہ اس میں سیاچن کے محاذ کی ابتدا سے لے کر آخر تک تمام تاریخ کو سمیٹا گیا ہے۔ اس میں ان وجوہات کی وضاحت بیان کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے سیاچن گلیشیئر پر بھارت کا قبضہ ہوا۔ سفرنامے بہت سے تاریخی حقائق سے بھی نقاب اٹھاتے ہیں۔ جیسے محولا بالا اقتباس میں بیان ہوا کہ پاکستانی کمانڈوز نے اہم معلومات پر توجہ نہ کی۔ انھیں نظر انداز کیا۔ جس کے نتیجے میں ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ چھ تاریخی واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں مؤرخ تاریخی کتابوں میں جگہ دینا مناسب نہیں سمجھتا اور وہ ان واقعات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ان واقعات کو نظر انداز کرنے کی ایک وجہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی عام انسان کی تاریخ ہوتی ہے۔ نہ کہ کسی سیاسی لیڈر کی۔ ایسا ہی ایک واقعہ رفیق ڈوگر نے اپنے سفرنامے آپریشن سیاچن میں بیان کیا ہے۔ اس آپریشن میں بہت سے ایسے انسان تھے جو جسمانی طور پر مفلوج ہو گئے تھے۔ شدید سردی اور برف کی وجہ سے ان کے اعضا کام کرنا چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے انھیں اعضا سے محروم ہونا پڑا۔ ملاحظہ ہو:

"اس محاذ کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۷ء میں مجموعی طور پر ایک سو گیارہ افسروں اور جوانوں کے اعضاء کاٹنے پڑے تھے۔ اڑتیس کے ہاتھ برف میں جل جانے سے کاٹنا پڑے تھے۔ چون کے پاؤں اور انیس کے ہاتھ بھی اور پاؤں بھی کاٹ دیے گئے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں یہ تعداد ۹۶ تھی اور ۱۹۸۵ء میں ۱۰۶۔"[۶]

اس سفرنامے کو پڑھ کر ہماری بہت سی تاریخ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سفرنامے کے مطالع سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں 'شاہ جہاں' ایک اہم کوہ پیما تھا جس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر حکومت پاکستان نے اسے تمغۂ اعزاز دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت جنرل ضیا الحق کا دورِ حکومت تھا۔ اس سفرنامے کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ۱۹۸۷ء میں جنرل ضیا الحق کا طیارہ بلاسٹ ہو گیا اور بے نظیر بھٹو برسرِ اقتدار آئی۔ جنرل ضیا الحق کے بعد مارشل لا ختم ہو گیا اور جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ تاہم شاہ جہاں بھی اس کی زد میں آ گیا اور اسے اعزازی تمغے سے نہیں نوازا گیا۔ بلکہ اسے رقم بھجوا دی گئی۔ پی آئی چیف نے بھی شاہ جہاں کو مبارک باد کا خط نہ لکھا جس کا شاہ جہاں کو بہت افسوس تھا کہ اس کا تعلق ان کے حلقے سے نہیں تھا۔ وہ تو بے ضرر سا ایک کوہ پیما تھا۔ جس کی کارکردگی کو سراہا جاتا تھا۔ تاہم اسے اس کے اس حق سے نئی حکومت نے محروم کر دیا۔ رفیق ڈوگر صاحب اس واقعہ کی روداد بیان کرتے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لکھتے ہیں:

''نوجوان شاہ جہان پاکستان کے چند معروف کوہ پیماؤں میں سے ایک ہے اور الپائن کلب کی ایگزیکٹو میں اپنا ساتھی ہے اس کی کوہ پیمائی اور کارکردگی کی بنیاد پر اسے حسنِ کارکردگی کے صدارتی تمغہ کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا مگر تمغے تقسیم ہونے سے پہلے صدر ضیا الحق بہاول پور کے حادثے میں مرحوم ہو گئے۔ تو منتخب بے نظیر جمہوری حکومت نے مارشل لا کی باقیات مٹانے کے لیے جو اقدامات کیے۔ شاہ جہاں بھی ان کی زد میں آ گئے۔ حکومت نے انھیں انعام کی رقم تو بذریعہ ڈاکیا بھیج دی۔ مگر ایوان صدر بلا کر تمغے وصول کرنے والوں کی فہرست سے نکال دیا گیا۔ جمہوریت کی بحالی کی خوشی اور جمہوری حکومت کے خوف میں پی۔ آئی۔ اے کے چیف نے بھی اپنی پی۔ آئی۔ اے کی اس نیک نامی پر شاہ جہان کو مبارک باد کا خط تک نہ لکھا۔''[۷]

''معرکہ نرتھنگ'' کے عنوان سے رفیق ڈوگر نے اپنے سفر نامے ''آپریشن سیاچن'' میں اس تاریخی معرکہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سفر نامے کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کس طرح وہاں کے مقامی لوگوں نے ڈوگرہ فوجیوں پر حملہ کیا تھا۔ جس کی وجہ سے بہت سے ڈوگرہ فوجی جا بحق ہوئے۔ ہمارے مجاہدین آخری وقت تک ان کا پیچھا کرتے رہے۔ تاہم اپنوں ہی کی غداری کی وجہ سے ہم نے شکست کھائی اور کارگل جیسا علاقہ پاکستان سے چھین کر غیروں کی آغوش میں چلا گیا۔ ۱۹۴۸ء کے اس تاریخی واقعہ کا بیان رفیق ڈوگر ایک صوبیدار وزیر حسین کی زبانی یوں کرتے ہیں:

''یہ وہ جگہ ہے۔ جہاں پر مقامی لوگوں نے ۱۹۴۸ء میں ڈوگرہ فوجیوں پر گھات لگا کر حملہ کیا تھا وہ دونوں طرف کی بلند پہاڑیوں پر چھپ کر بیٹھ گئے تھے اور جب سکردو کی اطراف بڑھنے والے ڈوگرہ فوجی اس جگہ آئے تو دونوں طرف کی پہاڑیوں پر سے حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے بہت کم بچ سکے تھے۔ ان کا بھی مجاہدین نے کارگل تک پیچھا کیا تھا اور پھر صوبیدار کی غداری کی وجہ سے کارگل کا علاقہ پاکستان کے ہاتھ سے نکل گیا۔''[۸]

''یہ دریا (شیوق) کارگل کی طرف سے آتا ہے۔ اسی کے کنارے کنارے وہ ڈوگرہ فوج ۱۹۴۸ء میں نرتھنگ تک آئی تھی۔ جسے مجاہدین آزادی نے الٹے پاؤں بھگا دیا تھا۔''[۹]

رفیق ڈوگر نے سیاچن کے دو دورے کیے۔ جب وہ سیاچن کے دورے پر گئے۔ تو اس وقت وزیر اعظم محمد خان جونیجو اور محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی سیاچن کا دورہ کیا۔ اس دورے کی باقاعدہ ویڈیو ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی۔ اس موقع پر بے نظیر بھٹو نے تقریر کرنے کی کوشش بھی کی۔ تاہم سیاچن کی اس بلندی پر انھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی ان کی ویڈیو میں سے تقریری حصہ کو مختصر دکھایا گیا۔ جس کا سادہ عوام کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ رفیق ڈوگر رقم کرتے ہیں:

''ہمارے سیاچن کے پہلے اور دوسرے دورے کی درمیانی مدت میں پاکستان کے دو عدد وزرائے اعظم نے اس محاذ پر حاضری لگوائی ۔مرد وزیر اعظم محمد خان جونیجو ہمارے پہلے دورے کے تھوڑی دیر بعد سیاچن کی طرف گئے تھے۔ خاتون وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے دورے کا حال پوچھا تو انھوں نے سوال کیا آپ نے ٹیلی ویژن پر وزیر اعظم کا سیاچن پروگرام نہیں دیکھا؟ ہم نے اپنی اس محرومی کا اعتراف کیا تو انھوں نے بتایا کہ دو تین ابتدائی فقروں کے بعد ہی وزیر اعظم کی سانس پھول گئی تھی اور لفظوں کی روانی ٹوٹنے لگی تھی۔ اسی وجہ سے ٹیلی ویژن والوں نے وزیر اعظم کی سیاچن یاترا کی فلم تو تفصیل سے دکھائی مگر تقریر برائے نام ہی سنائی۔''[۱۰]

رفیق ڈوگر نے اپنے سفر نامے میں صرف اس دور کی تاریخ نہیں بیان کی ۔جس دور میں انھوں نے ان علاقوں کا سفر اختیار کیا بلکہ انھوں نے ان علاقوں کی قدیم تاریخ کو بھی اپنے سفر نامے میں بیان کیا۔ اس لیے سفر ناموں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کہ اس میں اس وقت کی تاریخ کے علاوہ ان علاقوں کی قدیم تاریخ پر بھی سفر نامہ نگار نگاہ ڈالتے ہیں۔ رفیق ڈوگر نے سیاچن، شنگریلا اور بلتستان وغیرہ کے علاقوں کا آپریشن سیاچن کے دوران دورہ کیا اور ان علاقوں کی قدیم تاریخوں کو اپنے سفر نامے میں سمویا۔ رفیق ڈوگر یونانی مورخ ہیروڈوٹس کا حوالہ دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہیروڈوٹس کے مطابق بلتستان کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کا تعلق ترک سے تھا یعنی ان کی نسل ترک تھی اور انھیں ''درد'' کہا جاتا تھا۔ البیرونی کے مطابق کشمیر سے کچھ فاصلے پر بسنے والے لوگ ''بھٹ دان'' کہلاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں پر بھٹہ شاہ کی حکومت تھی جس کی مناسبت سے وہ لوگ ''بھٹ دان'' کہلائے۔[۱۱]

ان علاقوں کی مزید تاریخ رفیق ڈوگر کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''بھگوت گیتا والے کہتے ہیں ان پہاڑوں کے راجہ نے پانڈوؤں کو سونے کے ٹکڑے خراج میں پیش کیے تھے۔ اس طرح وہ آریاؤں کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایران کے شہنشاہ دارا اول اپنے امیر البحر سکائی لیکس کو سندھ کا منبع ڈھونڈنے بھیجا تو وہ پونچی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کسی نے لکھا کہ سکندر کے حملہ کے وقت چانکیہ موریہ کے بیٹے جندر گیت کو لے کر ان پہاڑوں میں آن چھپا تھا۔ سکردو کے قلعہ کے بارے میں روایت ہے کہ اس کی تعمیر راجہ مقبون نے کی تھی اور تکمیل اس کے پڑپوتے شیر علی خان انچن کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ لوک کہانیوں کے شوقین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انچن کی دہلی کے مغل شہنشاہوں سے رشتہ داری بھی قائم کر دیتے ہیں۔ان روایات کے مطابق اپنے چچا کے ظلم سے بھاگ کر انچن اکبر اعظم کی پناہ میں چلا گیا۔ اکبر نے اس کی مدد کی تو گدی پر قبضہ بحال ہونے پر اس کے احسان کا بدلہ دینے کے لیے انچن نے اپنی بیٹی کی ڈولی شہزادہ سلیم کو بھیج دی تھی۔ان راستوں سے گزر کر گندھارا کے بدھ مقامات کی یاترا کے چینی مسافروں کی روایات بھی قصہ کہانیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ان سب کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ بحث کی جا سکتی ہے۔ان سب میں اٹل تاریخی حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے لاہور کے سکھ دربار کے ایک جرنیل زورا ور سنگھ نے ان علاقوں کو فتح کر کے ان کا سیاسی تعلق شمالی ہندوستان کے ساتھ قائم کیا تھا۔اس سے پہلے تاریخ کے کسی عہد میں ایسے تعلق کا باقاعدہ ثبوت نہیں ملتا۔سکھ دربار سے اس تعلق کی وجہ سے کشمیر کے ساتھ ہی یہ کوہِ دامن بھی انگریزوں نے ڈوگرہ راجہ کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے۔مگر بعد میں ان کی جغرافیائی اور فوجی اہمیت کے پیش نظر راجہ سے گلگت ٹھیکہ پر لے کر وہاں پر اپنا نظم بھی قائم کر دیا تھا اور جب برصغیر آزاد ہونے لگا تو جلدی سے ٹھیکہ ختم کر کے سارا نظم ونسق ڈوگرہ کو واپس کر دیا تا کہ مسلمان کہیں آزادی کا مطالبہ نہ کر دیں۔انگریزی اور ڈوگرہ ملی بھگت کے باوجود ان معصوم اور پرامن لوگوں نے بغیر کسی بیرونی مدد کے اس سارے علاقے سے ڈوگرہ فوج کو مار بھگایا تھا اور اپنی مرضی سے امت مسلمہ کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا تھا۔‘‘[۱۲]

آپریشن سیاچن کے مطالعہ سے نہ صرف سیاچن کے محاذ کی تاریخ سامنے آتی ہے۔ بلکہ گلگت بلتستان کے علاقوں کی تاریخ ابتدا سے انتہا تک سامنے آجاتی ہے۔رفیق ڈوگر ان علاقوں کی تاریخ کے بیان کے ساتھ ساتھ بہت سے تاریخی حقائق سے بھی پردہ اٹھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔سفرنامے اپنے اندر بہت سے تاریخی معلومات سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔اس لیے ان کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔’’آپریشن سیاچن‘‘ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت ’’ضرب مومن‘‘ بھی جاری تھا۔رفیق ڈوگر ہمیں یہ تاریخی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں کہ ضرب مومن کی افواج ۱۹۶۵ء میں لڑی گئی پاک بھارت جنگ میں پاک فوجیوں سے تعداد میں زیادہ تھی وہ لکھتے ہیں:

’’دوران سوالات وجوابات ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت لڑائی کا ذکر آیا تو جنرل بلال احمد نے بتایا کہ ضرب مومن میں حصہ لینے والی افواج کی تعداد ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لڑنے والی افواج کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔‘‘[۱۳]

رفیق ڈوگر نے اپنے سفرنامے ’’آپریشن سیاچن‘‘ میں ایک مورخ کی طرح انسانی زندگی کی تاریخ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اپنے سفر نامے کے آخری باب بعنوان ''سکندر اعظم کا تعاقب'' میں سکندر اعظم کی جھلکیاں پیش کیں ہیں۔وہ سکندر اعظم کے اس تاریخ واقعے پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔جب سکندر اعظم نے دریائے جہلم کے کنارے دو شہروں کو آباد کیا تھا۔اس نے یہ شہر دریائے جہلم کی دائیں بائیں کنارے پر آباد کیے تھے۔ایک شہر کا نام اس نے اپنے گھوڑے کی مناسبت سے رکھا تھا اور دوسرے شہر کا نام فاتح کی مناسبت سے رکھا تھا کیوں کہ اس نے شہر کو فتح کیا تھا اسی وجہ سے اس نے شہر کا نام نکیا گری تجویز کیا تھا۔اس تاریخی واقعہ کا بیان کرتے ہوئے رفیق ڈوگر رقم طراز ہیں۔

> ''دریا جہلم کے کنارے سکندر اعظم نے دو شہر آباد کیے تھے ایک دائیں کنارے پر جہاں اس کا گھوڑا بوکی فالیہ مرا تھا۔دوسرا شہر اس نے بائیں کنارے پر آباد کیا تھا جہاں اس کی اور پورس کی لڑائی ہوئی تھی اور سکندر نے فتح حاصل کی تھی۔اس شہر کو وہ نکیا گری یعنی فاتح شہر کہتا ہے۔'' [۱۴]

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سفر نامے اپنی ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ویسے تو سفر ناموں کا وطیرہ غیر سنجیدہ اور غیر محققانہ ہوتا ہے کیوں کہ سیاح کا مقصد کسی مقالے کو طشت از بام کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا نصب العین چشم دید واقعات کو بیان کر کے پڑھنے والے افراد کی چشم وا کرنا ہوتا ہے۔تاہم یہ الزام کسی حد تک غلط ہے کہ سفر نامے غیر مستند ہوتے ہیں۔اس لیے کہ جب تاریخی واقعات سفر ناموں کے بیان کردہ حوادثات کے ہم پلہ ہوں تو انھیں غیر معتبر قرار دینا ناانصافی ہے۔

''آپریشن سیاچن'' کا عمرانی تناظر

عمرانیات کا تعلق آباد علاقے کی آب وہوا، آبادی قابل کاشت علاقے، ناقابل کاشت زمینیں، آب پاشی کا نظام، ذرائع آمد و رفت، نظام مواصلات، تعلیمی نظم و نسق، ماحولیاتی کیفیت، سماج و معاشرے کی تصویر کشی، زبان وادب، پیشہ جات اور دیگر کئی علوم سے جن کا انسان سے بالواسطہ یا براہ راست ربط و تعلق ہوتا ہے۔ان سب امور سے آگاہی صرف اسی کو ہو سکتی ہے۔جو کسی نئے علاقے میں وارد ہوا ہو یا اس نے کسی کی زبانی یا تحریر سے اس خطے کی واقفیت حاصل کی ہو۔''آپریشن سیاچن'' کے سیاح رفیق ڈوگر صاحب بھی ان میں سے ایک ہیں۔جنھوں نے بنفس نفیس اس برف پوش علاقے کا مشاہدہ کیا۔وہاں راتیں بتائیں، دن گزارے، وہاں کا رہن سہن، ماحول و گردو پیش دیکھا۔وہاں کی سادہ اور ہلکی غذا کھائی، کھلے میدانوں کا سناٹا سنا، بہتے دریاؤں کے دھاروں کو دیکھا، فلک بوس برفیلے پہاڑوں کا اونچائی سے معائنہ کیا۔وہاں کی ماضی سے قریب ہوئے، حال کا موازنہ کیا۔سیاچن کے لوگ سادہ مزاج اور جفاکش ہیں۔شدت کی سردی کا انھیں سامنا رہتا ہے۔لیکن پھر بھی یہ اپنے علاقے، اپنے مرز بوم، اپنی جائے پیدائش سے الگ نہیں ہوتے۔یہ لوگ ایسے موسم میں کافی راشن جمع کر لیتے ہیں جس موسم میں سردی کی شدت کا احساس قدرے کم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جاتا ہے۔تاہم جیسے ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔یہ اپنے گھروں میں قیدیوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔وہ اپنے گھروں میں آگ آلاؤ جلا لیتے ہیں۔سال کے کئی مہینے وہ ایسی ہی حالت میں گزارتے ہیں۔رفیق ڈوگر نے آپریشن سیاچن میں ان لوگوں کی سماجی صورت حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

''ان وادیوں کے لوگ مہینوں موسیاتی قید کی تیاری کرتے ہیں۔برف کے مہینوں کے لیے ایندھن اور خوراک ذخیرہ کرتے رہتے اور جب برف دروازوں پر دستک دیتی ہے۔تو اندر سے کنڈی لگا کر آگ کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔کچھ دوسرے علاقوں کی طرف محنت مزدوری کرنے کو نکل جاتے ہیں۔''[۱۵]

موسم کے مطابق سیاچن او رسکردو کے علاقے میں رہنے والے لوگوں کا لباس گرم ہوتا ہے۔یہاں کے پرانے لوگ میلوں پیدل سفر کرتے۔وزنی سامان اٹھا کر پہاڑوں کے نشیب وفراز سے گزرتے،یہاں کے لوگوں کی غذا سادہ ہوتی ہے۔خربوزے اور بڑا گوشت یہاں نہیں ملتا۔مرغ اس کمی کو پورا کرتا ہے مگر وہ بھی طلب اور ڈیمانڈ پر۔خال خال سبزیاں سبزی فروش سے دستیاب ہو جاتی ہے۔سکردو کے بازاروں کی صورت حال کا جائز لیتے ہوئے رفیق ڈوگر لکھتے ہیں:

''سکردو کے بازاروں میں ڈپٹی کمانڈر پون گھنٹہ خریداری کرتے رہے دو عدد ڈیڑھ کلو وزنی تربوز، پاؤ بھر پودینہ،نصف درجن بھر کھیرے،ایک کلوگرام ٹماٹر،سبز مرچیں ،اور دو تین لمبے لمبے خربوزے اس خریداری کے دوران ہم نے سکردو کے تقریباً سارے ہی بازار دیکھ لیے۔وہ اگلے مقامات والے جوانوں اور ہم دو عدد مہمانوں کے لیے ہر دستیاب سبزی خریدتے پھر رہے تھے۔مگر جس دکان پر ٹماٹر تھے وہاں پودینہ نہیں تھا۔جس کے پاس کھیرے تھے۔وہ مرچیں ختم کر چکا تھا ....مگر گوشت کسی ایک دکان سے نہیں ملتا۔اس کی کمی مرغ پوری کرتے ہیں۔مگر وہ ڈیمانڈ کے مطابق نہیں ہوتے مرغ اور تربوز باہر سے لائے جاتے ہیں۔گوشت راول پنڈی، اسلام آباد سے کوئی لے آئے تو لے آئے۔''[۱۶]

ان علاقوں میں بکثرت پایا جانے والا فواکہ خوبانی ہے لیکن اس کی حدت اور گرم مزاجی ایسی ہے۔ کہ اگر چار سے زائد کھالی جائیں تو پیٹ کھولنے لگتا ہے۔اور پھر بندہ باہر کی بجائے زیادہ وقت بیت الخلا میں گزارتا ہے۔چائے قہوہ تو بہت چلتا ہے۔شاید بیرونی انجماد کی طرح اندرونی انجماد خون کو اتنے درجہ حرارت پر رکھتے ہوئے منجمد ہونے سے روکنے کے لیے یہ تدبیر کی جاتی ہے۔ذرائع نقل وحمل کے لیے یہ لوگ زیادہ تر اپنے آپ پر ہی انحصار کرتے ہیں۔گدھے جیسی بار بردار، پہاڑی راستوں پر مضبوطی سے چلنے والی مخلوق شاہراہ ریشم، کی تعمیر کے بعد ہی ان لوگوں کے حصے میں آئی۔اس سے پہلے ان لوگوں نے گدھے کا اور گدھے نے ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں کا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ گدھے جیسے ہٹ دھرم اور اڑیل ہیں۔ اونچی آواز میں قہقہے لگانا، شور مچانا، اور دوسری کئی خماری رزائل سے کافی حد تک نا آشنا ہیں۔ جس کا مشاہدہ میدانی علاقوں میں رہنے والوں کو بخوبی ہوتا ہے۔ مذہبی لحاظ سے یہ لوگ ماضی میں بدھ مت اور بت پرستی سے لگاؤ رکھتے تھے۔ لیکن وہاں ایک مسلمان داعی کی کوششوں سے یہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ رفیق ڈوگر لکھتے ہیں:

> کہتے ہیں کہ! خپلو کی وادی میں اس علاقے کے راجہ کا سب سے بڑا مندر ہوتا ہے۔ جس میں گھوڑے کی قسم کا ایک بت لٹکا ہوا تھا سارا لوہے کا بنا ہوا نہ زمیں کو چھوتا تھا نہ چھت کو درمیان میں معلق تھا۔ اس مندر کو ''چن چق'' کہتے ہیں۔ جس کا بلتی زبان میں مطلب'' لوہے کی کثرت والی'' جگہ بنتا ہے۔ اس مندر کی بڑی پروہت ایک عورت ہوتی تھی۔ سارے بلتستان کے لوگ اس بت کی پوجا کرتے تھے۔ جب سید امیر کبیر ہمدانی اسلام کا پیغام لے کر آئے۔ تو لوگوں نے اسے معلق بت کے قہر سے ڈرایا۔ وہ انھیں خدا سے ڈراتے تھے لوگ انھیں بت اور اس کی بڑی پجارن کے غضب سے ڈراتے تھے۔ انھوں نے کہا چلو مجھے اس مندر لے چلو۔ وہ انھیں مندر میں لے گئے۔ سید امیر کبیر ہمدانی نے دعا کی اور خدا کے حکم سے لوہے کا معلق گھوڑا زمین پر آن گرا۔ سید صاحب نے کہا دیکھا نا میرا خدا کتنا بڑا ہے۔ اب آپ کو اس بت کی بجائے اس سب سے بڑے خدا کی عبادت کرنا چاہیے۔ لوگ خاموش رہے اور اپنی پروہت کی طرف دیکھنے لگے۔ امیر کبیر اسی عورت کو دعوت اسلام دی اور کہا کہ وہ اپنے ماننے والوں کو بھی حکم دے کر وہ ایک خدا کی عبادت کریں۔ پجارن نے شرط لگا دی کہ اگر سید امیر کبیر اس آہنی گھوڑے پر سواری کر کے خپلو وادی کا ایک چکر لگا آئیں۔ تو وہ اور اس کے ماننے والے ان کے خدا کو مان لیں گے۔ سید امیر کبیر نے یہ شرط مان لی خدا سے دعا کر کے آہنی گھوڑے پر سوار ہوئے اور وادی کے تین چکر مکمل کیے۔ پجارن اور سارے اس کو ماننے والے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو پجارن جادو کے زیر اثر دریائے شیوق سے آگے پہاڑوں پر تبت کی طرف اڑی جارہی تھی۔ جہاں اس کا بڑا پروہت رہتا تھا۔ سید امیر کبیر نے اپنا جوتا فضا میں پھینکا جو بجلی کی رفتار سے گیا اور پجارن کے سر پر پتھر کی طرح پڑنے لگا۔ جوتا پجارن کو واپس لے آیا۔ لوگوں نے اپنی پروہت کا حشر دیکھا تو سب نے اسلام قبول کر لیا۔ سید امیر کبیر نے اس مندر کو گرا کر اس کی جگہ خپلو کی سب سے بڑی مسجد تعمیر کی۔ جسے اب بھی ''چق چن'' ہی کہا جاتا ہے۔'' [۱۷]

بلتستان میں گندم کی کٹائی مشینوں سے نہیں ہوتی۔ بل کہ یہ اہم کام وہاں کی صنف نازک انجام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتی ہے۔ رفیق ڈوگر اپنے اسی طرح کے ایک مشاہدے کو یوں بیان کرتے ہیں:

''وہاں کی ایک ایک انچ زمین پر خواتین مصروف کار تھیں۔ چارہ کاٹتی ہوئیں، گندم کاٹ کاٹ کر اس کے چھوٹے چھوٹے مٹھے بناتی ہوئیں۔ ان مٹھوں کو اٹھا اٹھا کر سڑک کے دونوں کناروں پر لائن میں لگاتی ہوئیں۔ گندم سے دانے نکالتی اور دانوں سے بھوسا الگ کرتی ہوئیں۔ کسی راہ چلتی خاتون کی کمر پر چارے کی ٹوکری بندھی اور کسی کی کمر پر بچہ سویا رہا تھا۔ مرد سڑک کے کنارے پر ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے۔ کہیں مرد کو کام کرتے اور عورت کو فارغ بیٹھے نہیں دیکھا۔''[۱۸]

رفیق ڈوگر کا یہ مشاہدہ ان علاقوں کی سماجی صورت حال کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتا ہے۔ عام طور پر باہر کے کام، جس میں کھیتی باڑی، صنعت وحرفت اور محنت ومزدوری وغیرہ مرد سرانجام دیتے ہیں۔ تاہم ہر معاشرے کی معاشرتی صورت حال ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر علاقے کا اپنا ایک کلچر ہوتا ہے۔ ان علاقوں کی اپنی ایک عمرانیات ہوتی ہے۔ محولا بالا اقتباس سے واضح ہے۔ جس میں مرد کی بجائے باہر کے تمام امور عورتیں سنبھالتی ہیں۔ جب کے ان علاقوں کے مرد آلتی پالتی مارے بیٹھتے رہتے ہیں۔ گلگت بلتستان میں چوں کہ بہت کم حصہ برف سے کم مستور اور کھلا ہوا ہوتا ہے۔ ہر طرف برف سے ڈھکے ندی نالے، پہاڑ اور وادیاں ہیں اس لیے جہاں کہیں تھوڑی سی زمین برف سے خالی نظر آ جائے تو اس پر یہ لوگ گھر تعمیر کرنے کی بجائے کاشت کاری کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈوگر صاحب ایک گاؤں کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

''موضع گول ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مجموعی آبادی بمشکل پانچ صد نفوس ہو گی۔ ایک طرف دریا دوسری طرف پہاڑ درمیان میں تھوڑی سی زمین جس کے تھوڑے سے حصے پر مکانات اور باقی پر فصل درخت اور ایک عدد آبشار ایک چھوٹا سا جوہڑ ان علاقوں میں زمین کمیاب ہے اس لیے اس رہائشی مقاصد کے لیے کم از کم استعمال کرتے ہیں۔''[۱۹]

اس گاؤں متعلق رفیق ڈوگر مزید بیان کرتے ہیں کہ اس گاؤں کے افراد ایک دو کمروں کے گھروں میں رہتے ہیں۔ ایک کمرہ نیچے اور دوسرا اس کے اوپر ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اس انداز میں گھر تعمیر کرتے ہیں۔ اوپر والے کمرے کی دیواریں ایک درخت پلچھی کے باریک شاخوں سے بنائی جاتی ہے۔ ڈوگر صاحب بتاتے ہیں کہ جس طرح ہمارے ہاں ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ بالکل اسی انداز میں ان علاقوں کے لوگ اپنی دیواریں بناتے ہیں۔ ان کی چھتیں وہ کانٹے دار جھاڑیوں سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ پلچھی دیواریں تعمیر کرنے کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ ایک تو اوپر والے کمرے کا بوجھ نیچے والے کمرے پر کم پڑتا ہے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ جب ان دیواروں کو مٹی سے لیپ کر دیتے ہیں تو ان میں سردی جانے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔[۲۰] شادی بیاہ کا رواج بھی اس علاقے میں ویسا ہی جیسا دیگر علاقوں میں مروج ہے۔ البتہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں ہر تیسرا آدمی دو دو سوکنوں کا واحد سرتاج ہوتا ہے۔اس دور میں چار بیویاں، تفتیش کرنے پر پتا چلا کہ وہاں مردوں سے زیادہ عورتیں کام کاج کرتی ہیں اور مرد فارغ بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس صنف نازک کو جوتے میں زاک کے ساتھ جوت دیا جاتا ہے اور مرد ہل کی ہتھی سنبھالے ہوں ہوں کہتا ہل چلاتا ہے۔ یہ لوگ چار شادیاں اسلامی ازواجی تعداد کو پورا کرنے کے لیے نہیں کرتے۔ ان کا مقصد وحید یہ ہوتا ہے کہ جتنی زیادہ عورتیں ہوں گی۔ اتنا ہی زیادہ کام، اتنا ہی زیادہ فائدہ، فصل اور پیداوار میں اضافہ ہو گا۔ رفیق ڈوگر صاحب رقم کرتے ہیں:

> ''یہ عورتوں سے بہت کام لیتے ہیں۔ مرد کی بجائے کھیت کھلیان کا سارا کام بھی عورتیں کرتی ہیں۔ حد یہ کہ کھیت جوتنے کے لیے بھی ہل کے آگے عورتوں کو جوتتے ہیں۔ پنجابی میں ایک طرف زاک ہوتا ہے۔ دوسری طرف عورت اور مرد پیچھے سے ہل سنبھالتا ہے ....خواتین کے اسی فائدہ بخش استعمال کی وجہ سے اکثر مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ ان دیہات میں چار چار بیویوں والے عام مل جاتے ہیں۔'' [۲۱]

رفیق ڈوگر کا گزر جن جن علاقوں سے ہوا، انھوں نے وہاں کی سماجیات کو گہری نظر سے دیکھا۔ انھوں نے نہ صرف ان علاقوں کے رسم و رواج، شادی بیاہ اور مذہبی صورت حال کو بیان کیا بل کہ ان علاقوں کی تعلیمی صورت حال کا بھی جائزہ لیا۔ ایک گاؤں گوما میں تعلیمی رجحان بالکل نہیں تھا۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ان علاقوں میں تبدیلی رونما ہوئی اور کسی حد تک وہاں کے لوگوں نے تعلیم کی طرف توجہ دی۔ تاہم وہاں کے پرائمری سکولوں میں اساتذہ اکثر آنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس گاؤں کی معاشی صورت حال میں بھی تبدیلی آئی لوگ پہلے کی نسبت معاشی لحاظ سے بہتر ہو گئے۔ جب معاشی حالات بہتر ہو جائیں تو بہت سی چیزوں میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں نے نئے گھر بنوانا شروع کر دیے۔ ابتدا میں جب سکول اور مدرسے نہیں تھے۔ تو گاؤں کے لڑکے تعلیم حاصل کرنے لیے دور دراز کے علاقوں کا سفر کرتے تھے۔ اس گاؤں کے لوگ سیاچن گلشیر کے راستے لداخ جایا کرتے تھے اور نمک خرید کر لاتے۔ جب سردی کی شدت بڑھ جاتی تو وہ لوگ گھروں میں بیٹھ کر یہ نمک کھایا کرتے تھے۔ تاہم بعد میں صورت حال تبدیل ہو گئی اور لوگوں نے جانا چھوڑ دیا۔ گوما کے لوگ شادیاں بھی زیادہ کرتے تھے اور ان کے بچوں کی تعداد بھی کافی زیادہ ہوتی۔ ان کے بچے بارہ چودہ ہوتے تھے۔ گوما میں سال بھر میں ایک ہی فصل اگتی ہے۔ جب برف پڑتی ہے۔ تو یہاں کے لوگ سارے کام دھندے چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ گندم اور مٹر اگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی فصل نہیں ہوتی۔ ان کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی خوراک دہی اور حلیم تھی۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ اس گاؤں میں آٹا بھی آنے لگا اور لوگ روٹی کھانے لگ گئے۔ یہاں کے غریب لوگ جن کے پاس زمینیں زیادہ ہوتی ان کے پاس سے قرض لے لیتے اور فصل پر واپس کر دیتے تھے۔ اس گاؤں میں نیا ہسپتال بھی بن گیا تھا لیکن وہاں اکثر ڈاکٹر نہیں ہوتا۔ دہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ڈاکٹر اور استاد اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے نہیں سنبھالتے اسی لیے وہ سکولوں اور ہسپتالوں سے اکثر غائب رہتے۔[۲۲]

رفیق ڈوگر نے صرف ان علاقوں کی سماجی حالات کا جائزہ نہیں لیا۔ بل کہ انھوں نے سیاچن کے محاذ پر شہید ہونے والے سپاہیوں کی عمرانیات کو بیان کیا ہے۔ ایک ایسا سپاہی جو صرف اپنی بیٹی کے کہنے پر ریٹائرمنٹ لے رہا تھا۔ جس نے اس محاذ کے مکمل ہونے پر اپنے قیمتی لمحات اپنی بیٹی کے ساتھ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تاہم قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسے اس محاذ میں شہادت کا درجہ نصیب ہوا۔ رفیق ڈوگر رقم کرتے ہیں۔

> ''اب معلوم ہوا کہ وہ عید کارڈ ان جوانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے بھیجتے ہیں۔ مگر جب بھی عید کارڈ موصول ہوتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کاش کہ چوتھے جوان کی بچی بھی مجھے کارڈ بھیج سکتی۔ مگر میں نے تو اس کے باپ کی لاش اسے بھیجی تھی۔ وہ عید کارڈ کیسے بھیجے؟ وہ اپنے باپ کے آنے کا انتظار کر رہی تھی کہ باپ کی لاش پہنچ گئی۔ اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ اس کا باپ صرف اس کی محبت میں پنشن جا رہا تھا اس نے اپنی سروس کے پندرہ سال پورے کر لیے تو اس کی ترقی کے کاغذات بننے لگے۔ مگر اس نے ترقی لینے سے انکار کر دیا کہ میری بچی نہیں مانتی اس نے سیاچن کے محاذ پر سات ماہ گزارے تھے۔ وہ اس کا اس محاذ پر آخری دن تھا۔''[۲۳]

آپریشن سیاچن کے مطالعہ سے بہت سے شمالی علاقوں کی عمرانیات کا پتا چلتا ہے۔ ان لوگوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے، شادی بیاہ، اور بود و باش کا پتا چلتا ہے۔ اس لیے اس سفرنامے کی عمرانی اہمیت سے کسی طور پر بھی انکار کرنا ناانصافی ہے۔

''آپریشن سیاچن'' کا اسلوب

گفت گو میں تسلسل اور کلام میں فصاحت کا دور سامعین کو بات سننے اور اس میں دل چسپی لینے پر مجبور کر دیتا ہے اور جب خطیب یا مقرر کی زبان میں تسلسل کے بجائے جگہ جگہ سٹاپ اور ہر جملے کے بعد ایں آں کا اضافہ ہو اور ادبی چاشنی بالکل مفقود ہو تو سننے والے اکتا جاتے ہیں۔ ان کے کان ایک غیر مربوط، بے اثر، ادبی پیرائے، سے خالی سلسلہ سخن سنتے سنتے سن ہو جاتے ہیں۔ ان کے چہروں پر اکتاہٹ اور بوریت کے آثار جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ اونگھنا، کوئی نیند کے ہچکولے کھانے اور اور کئی زانو پر سر رکھے سونے کی تیاری میں ہوتے ہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت کسی تحریر کے مطالعے، مضمون کے تسلسل اور کسی منظر کی تصویر کشی یا کسی واقعے کی بیانی قلمی انداز سے ہوتی ہے۔ زبانی واقعے کو سناتے ہوئے دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی شخص کو اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے رکاوٹ یا بندش ہوتی ہے تو کبھی وہ ہاتھ ہلاتا ہے۔ گویا اس کی بات کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقناطیسی تعلق اس کے ہاتھوں سے ہے۔ جو اس کی بات کو کھینچ تان کے پھیلا رہے ہیں اور کبھی وہ اپنی اس معیوب خصلت کو دور کرنے کے لیے یوں کہتا ہے کہ جسے اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں تو وہ اس لاعلمی یا کم علمی پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنی مادری زبان کا ٹھیٹ بے دھڑک کہہ دیتا ہے۔ یا پھر اردو میں اس کا ترجمہ کر کے اسے اردو زبان میں ٹھونس دیتا ہے۔ جب اردو زبان و بیان اور ادب عالی سے واقف شخص اس کی تحریر دیکھتا ہے۔ تو اس کا واضح سقم اور علمی کم مائیگی نمایاں نظر آتی ہے۔ مثلاً جب کوئی پشتو زبان والا کہتا ہے۔ آپ کے ساتھ قلم ہے۔ تو یہ اس کی زبان میں ''تہ سرہ قلم اشتہ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کا اردو جزئیات کا یا وہ اردو میں ماسٹر کی ڈگری کے حامل نہیں ہوتے۔ تو ان کی تحریر میں ایسے عیوب کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ سکڑ سر دا بولتے ہیں۔ ''آپریشن سیاچن'' کو دونوں حوالوں سے دیکھا جائے گا۔ جہاں جہاں ان کے اسلوب محاسن نظر آئیں گے۔ ان کی نشان دہی کی جائے گی اور جہاں جہاں نقائص ظاہر ہوں گے۔ انھیں مع حوالہ نشان زدہ کیا جائے گا۔

> ''اس تفاوت اور تضاد کی تصویر بنانا چاہی تو کیمرے کی آنکھ سے پانی ٹپکنے لگا، پان صاف کر کے بٹن دبایا تو فلم نے حرکت سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر نے پوچھا تو اس نے نبض پر انگلیاں رکھے بغیر بتا دیا کہ کیمرے کے اندر محفوظ فلم بھی سردی کی شدت سے کھلی چھت پر سوئے ہوئے جولاہیاں دے جوائی کی مانند اکڑ گئی ہے اور آکسیجن سے بھی اس کی زندگی بحال نہیں ہو سکتی۔'' [۲۴]

کیمرے کی آنکھ سے پانی نبض پر انگلیاں رکھے بغیر دونوں جملوں میں انھوں نے کیمرے کی آنکھ یعنی جس دائرے سے تصویر بنانے کا عکس پڑتا ہے، کو انسانی آنکھ سے تشبیہ دی ہے اور کیمرے کے لیے نبض کا ثبوت استعارہ ہے۔ البتہ جولاہیاں دے جوائی یہ پنجابی کہاوت ہے۔ یہاں ان کی تنگ دامنی سامنے آ گئی ہے۔ کہ وہ اپنے پنجابی پن سے محفوظ نہ رہ سکے۔ حالاں کہ اردو میں اس کے لیے کئی محاورے مثالیں اور تشبیہات موجود ہیں۔ اس طرح کے کئی سوشے ان کی تحریر میں جا بجا ملتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''بچپن میں جب کسی بجھارت کا جواب نہ ملے تو اصول یہ ہوتا تھا کہ آپ کہہ دیں ہارے اور بجھارت ڈالنے والا جواب بتانے کا پابند ہو جائے گا۔'' [۲۵]

منظر کشی رفیق ڈوگر کے سفرنامے آپریشن سیاچن کا ایک اہم وصف ہے۔ انھوں نے جن علاقوں کی خاک چھانی۔ ان علاقوں کی منظر کشی بڑے دل کش انداز میں کی۔ ان علاقوں کا نقشہ ایسے کھینچا کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے اور مناظر واضح طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ ڈوگر صاحب سیاچن میں اپنی خواب گاہ کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

> ایسی خواب گاہ چشم تصور نے کبھی دیکھی نہ دیکھ چکنے کے بعد اسے تصور بند کرنا ممکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ برف کی بیرونی سطح سے چند زینے نیچے فرش اور اس سطح سے دو اڑھائی فٹ اونچی چھت ، باہر سے دیواریں پتھریلی اور اندر کی طرف نوکیلے پتھروں کو گرم کمبلوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ روشن دان کی عیاشی پتھروں میں ایک دو چھوٹے چھوٹے سوراخ بنا کر فراہم کی گئی۔" [۲۶]

ایک گاؤں موضع گول میں واقع امام باڑہ کی منظر کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"امام باڑہ پورا لکڑی کا بنا تھا، لکڑی کی دیواریں، لکڑی کی چھت اور لکڑی کے ستون چوکور عمارت کے درمیان ستون بہت پرانے معلوم ہوتے تھے۔ ان پر مختلف قسم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دیواروں میں لگی لکڑی کی منقش جالیاں کچھ پرانی تھیں کچھ نئی چھت پر بھی نقوش تھے۔ درمیاں میں کچھ حصہ میں رنگ رنگ کے شیشوں سے پرانی عمارت کو نئے ذوق کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔" [۲۷]

اخبار نویس کا لب و لہجہ جیسے عوامی ہوتا ہے۔ اس کا قلم بھی تقریباً اسی انداز سے چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات و کالموں میں کئی الفاظ ایسے در آتے ہیں۔ جو نہ اردو کا حصہ ہوتے ہیں نہ ادبا کی تحریروں سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ بل کہ وہ خود ساختہ سانچوں میں ڈھلے الفاظ ہوتے ہیں۔ جن کا مفہوم اور مطلب تو دوسرا شخص سمجھ لیتا ہے۔ تاہم اسے اسنادی درجہ دینے سے قاصر ہوتا ہے۔ ڈوگر صاحب ایک پر لکھتے ہیں:

"ان وادیوں کے لوگ مہینوں اس موسمیاتی قید کی تیاری کرتے ہیں۔" [۲۸]

حالاں کہ موسم کی طرف نسبت کے لیے موسمی مستعمل بھی ہے اور ادیبوں کی تحریروں میں سند کے طور پر موجود ہے۔ ہر زبان میں جب کسی شخص کے ساتھ کوئی خاص واقعہ پیش آتا ہے اور اس موقع پر وہ بے ساختہ کوئی جملہ کہہ دیتا ہے۔ تو وہ زبان کا جز لاینفک یعنی جدا نہ ہونے والا جز لازم بن جاتا ہے۔ مثلاً کسی چور نے ایک بکری چرائی اور کسی ویران گھر میں باندھ دی جس جگہ بکری بندھی تھی اس زمین کو بکری نے اپنے کھر سے کریدا تو نیچے سے چھری برآمد ہوئی تو بے ساختہ چور بولا۔ "الباحث عن حتفہ بظلفہ" اپنے گھر سے اپنی موت کا متلاشی اسی طرح پروین فارسی شاعر کا شعر ہے۔

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اب جب بھی کسی سے کوئی نادانی ہو جاتی ہے۔ جس پر اسے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ تو اس موقع پر یہ شعر کا ٹکڑا کہہ دیا جاتا ہے۔ مرزا غالب مرحوم آم بڑے شوق اور سلیقے سے کھاتے تھے۔ اتفاق سے ان کے پاس ایک دوست آیا ہوا تھا۔ جسے آم پسند نہیں تھے۔ آم کے چھلکے گدھے کو ڈالے گئے تو اس نے نہ کھائے۔ مرزا صاحب کا دوست کہنے لگا۔ جناب گدھا بھی آم نہیں کھاتا۔ مرزا غالب نے برجستہ جواب دیا۔ جی گدھا آم نہیں کھاتا۔ مراد مخاطب تھا۔ اب جب بھی کسی پر طنز کرنا مقصود ہو تو ایسا ہی کہا جاتا ہے۔ جیسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوا بھی مچھلی نہیں کھاتا اور برف والا پانی گدھے بھی نہیں پیتے۔ تاہم جو ضرب المثل اور محاورہ ہے۔ جیسا اہل زبان میں رائج ہے۔ اسی طرح برتنا ضروری ہے۔ اس تقدیم و تاخیر یا کانٹ چھانٹ اصول کے خلاف ہے۔ جیسے بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ قبر پر قبر نہیں ہوتی۔ دودھ کی مکھی کبھی کسی نے نہیں چکھی۔ ان میں زیادہ ہم وزن الفاظ ہوتے ہیں۔ جن کی رعایت ضروری ہوتی ہے۔ ورنہ ان کا تحریری نکھار ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ڈوگر صاحب نے اس اصول کی پرواہ کیے بغیر لکھا۔

''منھ میں رام رام بغل میں چھری''[۲۹]

جب کہ صحیح محاورہ یوں ہے۔

''بغل میں چھری اور منہ میں رام رام''[۳۰]

کئی مصنفین ایسے ہیں کہ ان کی عبارت میں رنگینی سے وہ کشش اور جاذبیت پیدا نہیں ہوتی۔ جو ان کے سادہ اور سلیس جملوں سے ہوتی ہے۔ استعاروں اور تشبیہات سے ان کے کلام میں جان نہیں آتی۔ جتنی اثر انگیزی ان کے جذبات قلب کی صحیح ترجمانی کرنے والے قلم سے نکلنے والے الفاظ سے ہوتی ہے۔ ڈوگر صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ جب وہ اپنے جذبات اندرون کو سطح قرطاس پر پیش کرتے ہیں تو پڑھنے والے متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ قاری کا دل ایک بار ہل جاتا ہے۔

''محفل شب میں سیاچن اور اس محاذ کی صورت حال کی بات ہوتی رہی۔ کمانڈر اپنے جوانوں اور افسروں کے جذبہ سے بہت مرعوب تھا۔ پنجاب رجمنٹ کا نوجوان کیپٹن وسیم چند روز پہلے برف کے طوفان میں پھنس گیا۔ اس کی ناک دونوں ہاتھ اور پاؤں برف سے جل گئے۔ امدادی پارٹی واپس لائی تو میں اسے دیکھنے گیا گلے سے لگایا تو وہ الٹا مجھے تسلیاں دینے لگا کوئی بات نہیں سر آپ فکر کیوں کرتے ہیں کوئی بات نہیں یہ کھیل کا حصہ ہے۔ حالا ں کہ اسے معلوم تھا کہ اسے زندگی بھر کے لیے اپنے اعضا سے محروم ہونا پڑے گا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔''[۳۱]

یہاں انھوں نے اس حادثے کو بڑی دل کشی سے پڑھنے والے کے دل میں اتارا ہے اور قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ عربی ضرب المثل ہے کہ ''قد الصدق الکذوب'' زیادہ جھوٹا کبھی سچ بھی بول دیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ سیاچن کے قلم نگار سیاح ہمیشہ غلط سلط ہی محاورے داغے چلے جاتے ہیں۔ بل کہ بعض مقامات پر صحیح محاورات کی ادائیگی بھی ان سے ہو گئی ہے۔

''شیوق سندھ کی نسبت زیادہ پرشور تھا۔ تھوتھا چنا باجے گھنا''[۳۲]

یہ محاورہ انھوں نے لکھا تو درست ہے تاہم موقع محل کے مطابق نہیں۔ اس محاورے کا مطلب تو یہ ہے کہ نالائق آدمی بہت شیخی بگھارتا ہے۔ جب کہ ان کا مقصد دریا شیوق کا زور و شور بتانا ہے۔ اس کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ محاورہ مستعمل نہیں بل کہ آسمان سر پر اٹھانا۔ یہاں زیادہ موزوں تھا۔ ''آپریشن سیاچن'' میں اگر محض اردو کو مدنظر رکھا جائے تو مذکر مونث الفاظ کا بے موقع استعمال اور محاورے کا غلط مطلب ہی نظر آتا ہے۔ جس کی کڑی وجہ ان کی زود نویسی اور پھر اس پر نظر ثانی نہ کرنے کی دوسری غلطی ہے۔ البتہ ان کی بعض عبارتیں ادبی شہ پارے اور دل کش ادبی ذوق کی حامل ہیں۔

''سکون، سکوت اور سیاہی ماحول میں ایک پراسراری کشش تھی اور دریا کے دوسری طرف خیمہ زن کسی فوجی قافلے کے دیے ٹمٹمارہے تھے، دریا دم سادھے، ہماری گفت گو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اونچے درختوں کے اوپر سے جھک سیاہ پہاڑ اپنے کان اسی طرف لگا دیے تھے۔ سفر کی آدھی تھکان دور ہوگئی۔ دل چاہتا تھا بقیہ سفر حیات کا بیشتر حصہ اسی مقام پر گزار دیا جائے کہ ڈپٹی کمانڈر نے ایک دم ٹوپی اٹھا کر سر پر جمالی، یہ روانی کی گھنٹی تھی۔'' [۴۳]

جب دو شخص آپس میں سوالاً جواباً گفت گو کر رہے ہوں تو اسے مکالمہ کہتے ہیں۔ مکالمہ نگاری بھی اردو ادب کا حصہ ہے۔ جس سے بات سمجھنے میں آسانی رہتی ہے۔ مکالمہ عبارت کو زور آور بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ رفیق ڈوگر نے بھی کئی جگہ اسی طرز نگاری کا جوہر دکھایا ہے۔

''جب آپ ادھر تھے تو اس وقت کوئی سکول تھا؟ نہیں جی کوئی سکون نہیں تھا۔ مسجد کے مکتب میں ہی ہم پڑھتے تھے۔ ہم سات آٹھ لڑکے تھے ہمارے بڑے بزرگوں نے بتایا کہ وہ گائے بکری، مکھن اٹھا کر سیاچن گلیشئر کے راستے ڈال دیتے ہیں۔ اور وہاں سے نمک خرید لاتے تھے پتھر کا نمک پھر وہ سردیوں میں کھاتے رہتے تھے۔

اب بھی کوئی لداخ جاتا ہے۔

نہیں وہ بڑا بوڑھا سب مر گیا، کوئی ہوگا۔ پاکستان بننے کے بعد کوئی نہیں گیا

اس وقت آپ سکردو کتنے دن میں پہنچ جاتے تھے؟

اس وقت ہمارا ادھر پہاڑ کے اوپر سے جانا تھا سات دن لگ جاتے تھے۔'' [۴۴]

طنز و مزاح ایسا دل چسپ اور جاذب انداز اسلوب ہے کہ سننے، پڑھنے والا جتنا مزہ چٹخارے دار چیزیں کھا کر محسوس کرتا ہے۔ اس سے کہیں بڑھ کر طنز و مزاح کے طرز ادا اور طریقہ نگارش سے محفوظ ہوتا ہے۔ تاہم جس تحریر یا گفت گو میں یہ عنصر مفقود ہو تو اس کے سامعین اور قارئین ایک تشنگی اور بے نام سی کمی محسوس کرتے ہیں۔

''ذرا کھلے آسمان کے نیچے آئے تو ایک سواری مل گئی۔ ایک فوجی جوان پتھر روندتا جارہا تھا۔ وہ صبح کسی اگلی پوسٹ سے چلا تھا اور گوما سے پیاز خرید کر واپس جارہا تھا صرف پیاز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے اتنا کٹھن سفر جی ہاں پیاز کے لیے اس کے پاس کوئی گٹھڑی تھی نہ تھیلا پیاز کہیں جیب وغیرہ میں چھپایا ہوا تھا۔ اتنے سے پیاز کے لیے صبح سے سفر کر رہا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے گو ما سے ملا ہی اتنا سا پیاز ہو۔ اگلے مورچوں پر پیاز سب سے بڑی عیاشی ہے۔ پیاز، ہری مرچ، اور اچار مگر چوں کہ معاملہ سیاچن اور ملک کے دفاع کا ہے اور حکومت اس سلسلے میں کوئی عیاشی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ اگلی ڈیوٹی والوں کو تعیش کی خوراک کے بجائے طاقت ور خوراک سپلائی کرتی ہے۔ ہنٹر بیف اور پنیر کے ڈبے بھیجتی ہے۔ مگر جوان اور افسر سخت نگرانی اور ضوابط کے باوجود چوری چھپے پیچھے سے پیاز اور ہری مرچیں منگوا کر عیاشی کر لیتے ہیں۔ ہنٹر اور بیف چوں کہ ان گھروں اور علاقوں میں کھایا نہیں جاتا۔ جہاں سے جوان بھرتی ہو کر آتے ہیں۔ اس لیے اگلی پوسٹوں پر بھی دال کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ مہنگا ہنٹر بیف اور پنیر کوہ و بیاباں کے سپرد کر دیتے ہیں۔" [۳۵]

رفیق ڈوگر صاحب کے سنجیدہ اسلوب میں کہیں کہیں مزاح نگاری کے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ جوان کی تحریر کو مزید دل چسپ بنا دیتے ہیں۔

☆☆☆☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوالہ جات وحواشی

۱۔ رفیق ڈوگر، انٹرویو از راقم الحروف، بمقام: رہائش گاہ رفیق ڈوگر، راجپورت ٹاؤن ،لاہور، ۶ فروری 2015ء

۲۔ شیر باز علی خان پراچہ، ''عکس گلگت بلتستان''، گلگت، نارتھ پبلی کیشنز، 2013ء، ص: ۱۷۵

۳۔ رفیق ڈوگر، ''آپریشن سیاچن''، لاہور، جنگ پبلشرز، ۲۰۰۰ء ص: ۱۵

۴۔ ایضاً، ص: ۲۳

۵۔ ایضاً، ص: ۲۴

۶۔ ایضاً، ص: ۳۵

۷۔ ایضاً، ص: ۶۲

۸۔ ایضاً، ص: ۷۰

۹۔ ایضاً، ص: ۷۵

۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۱۱

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۵۸

۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۵۹

۱۳۔ ایضاً، ص: ۲۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص: ۲۶۶

۱۵۔ ایضاً، ص: ۴۴

۱۶۔ ایضاً، ص: ۶۷

۱۷۔ ایضاً، ص: ۶۴،۶۵

۱۸۔ ایضاً، ص: ۷۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۔ ایضاً، ص: ۷۲

۲۰۔ ایضاً، ص: ۷۲

۲۱۔ ایضاً، ص: ۷۴، ۷۵

۲۲۔ ۱۰۰، ۱۰۳

۲۳۔ ایضاً، ص: ۱۲۲

۲۴۔ ایضاً، ص: ۲۲

۲۵۔ ایضاً، ص: ۲۷

۲۶۔ ایضاً، ص: ۳۴

۲۷۔ ایضاً، ص: ۷۳

۲۸۔ ایضاً، ص: ۴۴

۲۹۔ ایضاً، ص: ۴۵

۳۰۔ مرتضیٰ حسین، سید، قائم رضا، سید، محمد باقر، آغا، (مرتبین)، ''نسیم اللغات''، لاہور، شیخ غلام علی، بارنہم، ۱۹۷۹ء

۳۱۔ رفیق ڈوگر، ''آپریشن سیاچن''، لاہور، جنگ پبلشرز، ۲۰۰۰ء، ص: ۶۶

۳۲۔ ایضاً، ص: ۶۶

۳۳۔ ایضاً، ص: ۷۸

۳۴۔ ایضاً، ص: ۱۰۱

۳۵۔ ایضاً، ص: ۱۰۷

© rasailojaraid.com